قدیم عربی ادب کے تحت قرآنی اصطلاح "اَللَّمَمَ" کی معنوی تحقیق وتعیین

ڈاکٹر محمد عارف خان ساقی

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ علوم اسلامیہ، جامعہ کراچی، کراچی

Abstract

Every word has its own meanings.To understand the real message of a text we need to know the real and accurate meaning of each word.It is observed that there are so many words in each language that are not used but very rarely in both spoken language and literature.It makes the word like that a strange word for the common people.Even most of the scholars of that language don't have a proper knowledge about its meaning.So they will not be able to define and explain the meaning of that word. It is also noted as a common practice that at the time a word of this nature comes to their knowledge,instead of consulting the dictionaries, they try to guess it's meanings.Every one of us knows that no guess can be hundred percent accurate.And this is also quit clear that practice like that makes the word lose its own meaning.After many decades this caricature becomes effective in that language with another sense.The legislation could not afford these changes and requires endeavors to restore the real sense of that word.The classical literature can restore the original meaning of that word.Especially if the interpretation of the rules and regulations is based on the meaning of a word so there will be some unavoidable problems. Unfortunately there are many words in the Holy Quran that we still unaware of its real meanings. But there is also a source which can solve this problem and restore the real sense of a word.And that source is the ancient literature of Arabs.Along with other sources the ancient Arab's literature can make us know the real meaning of any of the Quranic word.A word of this category is taken from the Holy Quraan and that is "اَللَّمَمَ" (Al-Njm:32) and a reliable meaning of this word brought out with the help of the Ancient

Arab's Literature.It is also noted that this method can also be applied on such places where we find the difference of opinions between the Translators of the Holy Quran.This method of research can solve the problems and give a valuable insight about the real teachings of the Holy Quran.

Key words:Arabic Literature,Quran,Al-Lamam

تمہید

قرآنِ حکیم میں بہت سے مقامات ایسے ہیں کہ جن کی معنوی تعین ابھی باقی ہے۔علماء ومفسرین نے اپنی کوشش ضرور کی ہے مگراس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اقوال وآراء کے طومار لگ گئے ہیں۔اقوال وآراء کا تعدداور تنوع ایک افسوسناک صورتحال یہ بھی پیدا کرتا ہے کہ ناظر وقاری کو یہ اختیار تفویض کرتا ہے کہ وہ جس رائے یا قول کو چاہے قبول کرلے اور جسے چاہے چھوڑ دے۔یہ سلوک کتاب اللہ کے ساتھ کسی بھی طرح سے مناسب و جائز نہیں کہا جا سکتا۔عین ممکن ہے کہ قول مختار، مراد ومقصودِ قائل ہی نہ ہو۔اور جو مراد ومقصود قائل ہو وہ قول متروک ومرجوح قرار پا جائے۔اہلِ ایمان کے نکتۂ نگاہ سے یقیناً یہ خطرناک عمل ہوگا۔یوں ضروری ہو جاتا ہے کہ تمامتر ممکنہ ذرائع ووسائل کو بروئے کار لاکر کسی حتمی نتیجہ تک رسائی پیدا کر لی جائے۔شرط یہ ہے کہ متعلقہ تمامی دلائل ومباحث کا غیر متاثرہ ذہن کے ساتھ دیانت دارانہ تجزیہ کرنا ہوگا۔

مقالہ کی غرض وغایت

غرض وغایت یہ ہے کہ ایک ایسا طریقۂ کار وضع کیا جا سکے اور ایک ایسا اسلوبِ تحقیق متعین ہو سکے جس کی پاسداری کا نتیجہ یہ ہو کہ قرآنِ حکیم کے اُن جملہ مقامات کی گتھیاں سلجھائی جا سکیں جو ہنوز مختلف فیہ رہ کر ایک معمہ بنے ہوئے ہیں۔قرآنِ حکیم پر ایمان رکھنے اور اس کا احساس کرنے والوں پر لازم ہے کہ ایسی کوئی نظیر قائم کریں جو ان مشکلات پر قابو پانے میں مددگار ثابت ہو سکے۔اور علم وتحقیق کی بنیاد پر وہ راہیں مسدود ہو جائیں جو اختلاف رائے کی آڑ میں ایک طویل عرصے سے ملت میں تفریق وتقسیم کا باعث بنی ہوئی ہیں۔یہ فرض کر لینا زیادتی بھرا رویہ ہے کہ یہ اختلاف رائے کسی طرح سے دور نہیں ہو سکتا اور اتفاقِ رائے پیدا کرنے کی اب کوئی صورت ہی نہیں بچی ہے۔ذرا فرصت ہو تو ادبِ عربی کے تناظر میں ایک منظّم ومربوط مطالعہ قرآنِ حکیم کے ان مختلف فیہ مقامات کے تعلق سے سینوں کی سب تنگیاں دور کر کے شرحِ صدر عطا کر سکتا ہے۔یہ عمل، شکوہ ظلمتِ شب کی بجائے اپنے حصے کا چراغ روشن کرتے جانے کی سمت میں ایک مبارک اقدام اور قرآنی شعورِ اجتماع کے فروغ کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔لسانی زوال و انحطاط کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ کلمہ اہلِ زبان کی زبانوں پہ تو چڑھا رہتا ہے مگر غیر محسوس طریقے پر اپنے حقیقی معنی ومفہوم سے سرک جاتا ہے۔وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ اہل زبان ہر کلمہ کے تعلق سے اہل فہم و دانش سے رہنمائی لینے یا لغات کا مطالعہ کرنے کی بجائے محض موقع کی مناسبت سے ہی اُس کے معنی کا تعین یا ادراک کرتے ہیں۔یوں کلمہ اپنے حقیقی معنی ومفہوم کی ادائیگی کے قابل نہیں رہتا۔اور اگر اس طرزِ عمل پہ صدیوں تک اہل زبان آگے بڑھتے رہیں تو زبان اور اُس کے کلمات تو بدستور اُن کے استعمال میں بلکہ نوک زبان پہ ہی رہیں گے مگر اُس کلمہ کو سن کر زمانوں پہلے کے لوگوں کے ذہن میں جو معنوی نقوش ابھرتے تھے وہ ان نقوش سے

خاصے مختلف ہوں گے جوان کے ذہنوں میں نمایاں ہوتے ہیں۔ یونہی کچھ کلمات متروک وغیر مستعمل بھی قرار پاجاتے ہیں۔ یہ بات تجربہ کی بنیاد پر اب ثابت شدہ ہے کہ قدیمی مگر متروک وغیر مانوس قرار پانے والے کلمات کے ادبِ عالی سے متعدد و متنوع استعمالات و نظائر کو منظر عام پہ لاکر اُس کلمہ کے تعلق سے انسانی طبیعتوں میں پیدا شدہ اس غیر مانوسیت کو اگر دور کر دیا جائے اور انسیت کی سطح بڑھادی جائے تو ذہن انسانی قدیم وقتوں میں رائج وشائع اُس کے حقیقی معنی ومفہوم تک رسائی پیدا کرنے کی بھر پور صلاحیت رکھتا ہے۔ اس طریقے سے قرآن حکیم کے مفردات کی جملہ مشکلات آسان ہوسکتی ہیں۔ یہ طریقہ کار کتاب اللہ کے ساتھ سچی اور مخلصانہ وابستگی رکھنے والے لوگوں کے ایمان کی پختگی کا باعث بھی ہوگا۔ عہدِ جاہلیت کا لسانی ادب، عربی کلمات کے درست معنوی تعین کے حوالے سے اہل ایمان کے لیے بیش قیمت سرمایہ ثابت ہوسکتا ہے۔

عہدِ جاہلیت کا لسانی ادب

عربوں کا عہدِ جاہلیت وہ دور ہے جب عربی زبان کو بہت ترقی نصیب ہوئی ہے۔ حد یہ ہے کہ فصیح وبلیغ عربی میں کلام کرنا اوراس کی باریکیوں اور لطافتوں پہ مطلع ہونے کی جستجو رکھنا عام لوگوں بلکہ بکریاں چرانے والوں تک کے ذوق کا بھی حصہ بنادیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نزول قرآن سے پہلے کے وقتوں میں عربوں کو اپنی زبان دانی پہ بہت ناز تھا۔ خود کو عرب یعنی ''فصیح اللسان'' اور باقی دنیا کے لوگوں کو عجمی یعنی ''گونگے'' کہا کرتے تھے۔ اُن کے ہاں ادبی سرگرمیاں بھی بہت غیر معمولی تھیں۔ عالی شان قصیدے تخلیق کیے جاتے تو فخر یہ اُن کو خانہ کعبہ کی دیواروں کے ساتھ آویزاں کر دیتے تھے۔ خانہ کعبہ، مرجع خلائق تھا۔ زیارت کے لیے لوگوں کی آمد ورفت کا سلسلہ جاری وساری رہتا تھا۔ اس سے اُن قصائد کی خوب تشہیر ہوتی تھی۔ اس طریقے سے دور افتادہ علاقوں میں رہنے بسنے والوں میں سے ہر چھوٹے بڑے تک اُن کا یہ پیغام پہنچتا تو ہر کوئی اُس پہ غور وخوض بھی کرتا اس طرح انہوں نے اپنے عام لوگوں کی زندگی میں بھی ایک طرح سے لسانی ہلچل مچا رکھی تھی اور ادبی انقلاب برپا کر دیا تھا۔

عربوں کے مشہور قصائد ''معلقات'' اسی طرح سے معرض وجود میں آئے تھے۔ مگر تخلیق قصائد کی اس روش کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ایک چیلنج سامنے آیا تو پھر یہ سلسلہ نہ تھما۔ ایک کے بعد ایک اور قصیدہ سامنے آتا گیا اوران کی تعداد سات تو یقینی ہے۔ یہ کتاب ''السبع المعلقات'' کے نام سے مشہور ومتعارف ہے۔ بقول بعض ان قصائد کی مجموعی تعداد دس تھی۔ چنانچہ یحیٰ بن خطیب تبریزی کی ''القصائد العشر'' میں ایسے دس قصائد شامل ہیں۔ یہ کتاب بھی مشہور ومتداوّل ہے۔ طویل قصائد پر مشتمل ان شعری تخلیقات کو مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان کو معلقات بھی کہتے ہیں اور وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ فخریہ ان کو خانہ کعبہ کی دیوار پہ آویزاں کیا گیا تھا۔ اِن کو ''مُذَهَّبَات'' بھی کہا جاتا ہے۔ وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ان کو سونے کے پانی سے لکھا گیا تھا۔ یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ یہ سنہری حروف سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔ ان کا ایک نام ''سُمُوط'' بھی ہے۔ یہ سمط کی جمع ہے اور اس سے مراد ہے حرزِ جاں بنا کر گلے کا ہار بنائے جانے کے لائق قصائد۔ اِن باتوں کا ذکر فوّاز الشّعار نے شرح القصائد العشر کے مقدمہ میں کیا ہے۔ (۱)

یہ عام فہم بات ہے کہ عہدِ جاہلی میں اگر اس نوع کی ادبی سرگرمیاں عروج پہ رہی ہیں تو ان کے لازمی اثرات تو اُس عہد

کے لوگوں کی ذہنی حالت پہ ضرور مرتب ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ اُن لوگوں کو یہ زُعم تھا کہ سخن آوری اور سخن فہمی میں وہ اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے۔ ان سرگرمیوں کا ایک حاصل یہ بھی تھا کہ وہ ذہن اس قابل ہو چکا تھا کہ اگر غور وخوض سے کام لے لے تو وہ قرآنِ حکیم کے پیغام سے پوری طرح سے آگاہ ہو جائے۔ حتیٰ کہ دور دراز علاقوں میں رہنے والے بدو اور چرواہے زبان دانی کے معاملے میں کمال مہارت کے حامل تھے اور اسی ناتے ان کی زبان سے صادر ہونے والے فقرات تحلیل عبارات کے معاملے میں آج بھی سند مانے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ محض کوئی اتفاق نہیں تھا بلکہ قدرت کا اہتمام تھا۔ دراصل یہ تبدیلی نزولِ قرآن کے لیے زمینی حالات کو سازگار بنانے کے لیے ہی روبہ عمل لائی گئی تھی۔ لوگ اس قابل ہو چکے تھے کہ کلام کی نشست و برخاست اور اُس کے مدعا و مرام کو آسانی سے سمجھنے لگ گئے تھے۔ فضا جب سازگار ہو چکی تو ہی نزولِ قرآن کا آغاز ہوا تھا۔

قرآنِ حکیم نے جن لوگوں سے اولین خطاب کیا ہے اُن کا زبان دانی پر مبنی غرور توڑنے اور اُن کا یہ خمار اُتارنے کے لیے اپنے ابتدائی وقتوں میں ایک ایسا اسلوبِ بیاں اختیار کیا ہے جس سے اُن لوگوں کے سر چکرا کر رہ گئے تھے۔ پھر اُن کو چیلنج بھی دیا کہ ہمت ہے تو تم اس کلام کے جیسا بنا کے لاؤ۔ اپنی تمامی صلاحیتوں کو بروئے کار لاؤ۔ اپنے جملہ اعوان و انصار کی مدد بھی لے لو۔ مگر ''السبع المعلقات'' جیسی لاجواب اور مثالی نوعیت کی شعری تخلیقات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے عرب فصحاء قرآنِ حکیم کے اس چیلنج کے جواب میں ساکت و جامد اور بے حس و حرکت نظر آتے ہیں۔ لگتا ہے عاجزی و بے بسی کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ یہ قرآنِ حکیم کا اعجازِ بیاں ہی تھا جس نے اُن کو زبان دانی کے غرور پر مبنی خول سے باہر نکل آنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ پھر سورہ ٔ قمر جو کہ مکی سورت ہے متعدد بار یہ اعلان عام کرتی ہے:

وَلَقَدۡ يَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّكۡرِ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ (القمر:۱۷)

''یقیناً ہم نے قرآن کو از روئے یادداشت و عبرت پذیری آسان کر دیا ہے تو کیا ہے کوئی یاد رکھنے عبرت لینے والا''؟

یہ قرآنِ حکیم کا دوسرا اُسلوبِ بیاں ہے۔ اور جب آسانی پیدا کی تو عالم یہ ہے کہ اس سہولت کو ''سہل ممتنع'' کہا جا سکتا ہے۔ یعنی اتنا آسان کہ اس سے زیادہ آسان کلام کرنا ممکن ہی نہیں۔

قرآنِ حکیم اہل زباں عربوں کو خطاب کرتے ہوئے سورہ ٔ یوسف میں کہتا ہے:

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ (یوسف:۲)

''یقیناً ہم نے اس کتاب کو ایک فصیح و بلیغ قرآن کے طور پہ اُتارا ہے تاکہ تم لوگ سمجھ سکو''۔

سورہ فصلت میں ارشاد:

كِتٰبٌ فُصِّلَتۡ اٰيٰتُهٗ قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ (فصّلت:۳)

''فصیح و بلیغ قرآن کے طور پر یہ ایک ایسی کتاب ہے، جس کی آیات کو، ایک ایسی قوم کے لیے جو جانتی ہے، خوب کھول کر بیان کر دینے والی فیصلہ کن اور دوٹوک بنا دیا گیا ہے۔''

سورہ زمر میں قرآن حکیم دوٹوک انداز میں یہ اعلان بھی کرتا ہے:

قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ (الزمر:۲۸)

''فصیح و بلیغ قرآن کے طور پر ہر طرح کی کجی سے پاک ہے تا کہ یہ لوگ اپنا بچاؤ کر لیں''۔

چنانچہ زمانہ قبل از اسلام کا وہ عربی ادب آج بھی موجود اور محفوظ ہے۔ یہ خاصی بڑی حد تک قرآن فہمی کے عمل میں ممد و معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ یہاں یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ''عربی زبان کے زندہ زبان ہونے'' کے تصور کی بھی مختصراً وضاحت کر دی جائے۔ ماہرین ادب عربی کا اس امر پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کی ان بہاروں کا عہدِ رسالت مآب علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے گزرتے ہی زور ٹوٹ گیا تھا۔ بعد کے وقتوں کا کلام اس پائے اور پلے کا نہیں ہے جو کہ قبل ازیں یعنی عہدِ رسالت سے بھی اگلے وقتوں میں ہوا کرتا تھا۔ عربی ادب کے تعلق سے چار طبقات اہل ادب کے ہاں بہت معروف ہیں۔ پہلا عہدِ جاہلی ہے جس کے ادبی ذخیرہ کو سند کا درجہ حاصل ہے۔ دوسرا طبقہ ''مُخَضْرَم'' کہلاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عہدِ جاہلی میں بھی شاعری کرتے رہے اور عہدِ رسالت میں بھی ان کا یہ شغل جاری وساری رہا ہے۔ ان کے معاملے میں احتیاط کو لازم رکھا گیا ہے۔ '' مُخَضْرَم'' کا لفظی معنی ہے: ''دورنگا'' یعنی عہدِ جاہلی کی خالص ادبی زبان کی جھلک بھی ان کے ہاں پائی جاتی ہے اور یہ حصہ تو معتبر ہے۔ مگر عہدِ رسالت مآب علیٰ صاحبہ الصلوات والتحیات میں ان کی شاعری کا زیادہ اعتبار نہیں ہے۔ تیسرا طبقہ اسلامی شعراء کا طبقہ ہے۔ اور چوتھا ''مُوَلَّدِیْن'' کا طبقہ ہے۔(۲) مؤخر الذکر دونوں طبقات زمانۂ مابعدِ رسالت مآب علیٰ صاحبہ الصلوات والتحیات کے ادیب وشاعر ہیں۔ ان کی ادبی تخلیقات کو معیاری تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہی قرآن فہمی کے عمل میں ان پہ تکیہ وانحصار کیا جا سکتا ہے۔ اس معنی میں زندہ زبان ہونے سے یہ ہرگز مراد نہیں ہوسکتی کہ یہ زبان آج بھی لکھی، پڑھی اور بولی جاتی ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اس زبان کے عہدِ جاہلیت سے تعلق رکھنے والے گراں قدر ادبِ عالی کو صحیفوں میں محفوظ بنا دیا گیا ہے۔ رافعی اپنی معروف کتاب تاریخ آداب العرب میں لکھتے ہیں:

''اِجْتَمَعَ الْمُتَاَخِّرُوْنَ عَلٰی جَعْلِ التَّدْبِیْرِ فِیْ وَضْعِ "تَارِیخِ اَدَبِیَّاتِ اللُّغَةِ الْعَرَبِیَّةِ" اَنْ یُقَسِّمُوْا هٰذَا التَّارِیْخَ اِلٰی خَمْسَةِ عُصُوْرٍ: اَلْجَاهِلِیَّةُ، فَصَدْرُ الْاِسْلَامِ، فَالدَّوْلَةُ الْاُمَوِیَّةُ، فَالْعَبَاسِیَّةُ اِلٰی سُقُوْطِهَا۔۔۔، ثُمَّ مَا تَعَاقَبَ مِنَ الْعُصُوْرِ بَعْدَ ذٰلِكَ''(۳)

''ماہرین ادبِ عربی میں سے متاخرین کا اس امر پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ عربی زبان کی ادبیات کو تاریخی طور پر بیان کرنے کی یہ سبیل پیدا کی ہے کہ پوری تاریخ کو پانچ ادوار میں تقسیم کر دیا ہے: ادبِ عہدِ جاہلی، پھر صدرِ اسلام، پھر عہدِ بنی امیہ، بعد ازیں عہدِ بنی عباس کی ادبیات اور آخر میں عہدِ بنی عباس کے خاتمہ ۸۵۶ ہجری سے تا بہ امروز۔''

زیرِ نظر مقالہ میں '' اَلسَّمَرَ '' کی حقیقت تک رسائی کے لیے عہدِ جاہلی کے اسی محفوظ ادبی ذخیرہ سے مدد لی گئی ہے جس کو ماہرین نے، ماسوائے قرآنِ حکیم اور احادیث وآثار، دیگر تمامی ادبی تخلیقات پر بہر اعتبار عام فضیلت وفوقیت دی ہے۔

قضیہ کا تعارف

قرآنِ حکیم میں لاتعداد ایسے مقامات ہیں جہاں مترجمین ومفسرین نے جدا جدا معانی مراد لیے ہیں۔عربی جیسی فصیح وبلیغ، صاف ستھری اور پوری طرح سے نکھری ہوئی زبان میں اس نوع کے تعبیری ابہام دیکھ کر بجا طور پر حیرت ہوتی ہے۔ہم کسی ادیب و دانشور کی تحریر میں اس قدر ابہام تلاش نہیں کر پاتے جس قدر خود ہمارے اپنے ہاتھوں سے قرآنِ حکیم کی بابت اب تک منظرِ عام پہ آ چکے ہیں۔اس اختلافِ رائے کو ایک اور نظر سے بھی دیکھنا ضروری ہے۔قرآنِ حکیم کی صداقت وحقانیت اور اس کے وحیٔ الٰہی پر مشتمل ہونے کو جاننے اور پرکھنے کے لیے خود قرآنِ حکیم نے ہی ایک معیار قائم کر رکھا ہے جس پہ توجہ کی ضرورت ہے۔ قرآنِ حکیم شعورِ عام سے جسے ہم شعورِ اجتماع بھی کہہ سکتے ہیں، یہ سوال کرتا ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (النساء:۸۲)

’’تو کیا یہ لوگ قرآن پر تدبر ہی نہیں کرتے؟ بات یہ ہے کہ اگر یہ اللہ کی بارگاہ سے نہیں بلکہ کسی اَور کی طرف سے آیا ہوا ہوتا تو یقیناً ان لوگوں کو اس میں بہت اختلاف نظر آتا۔‘‘

ہم نے اس قرآنی اصول کو نظر انداز کیا ہے۔اسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری قوم میں اختلاف در اختلاف کی روایت بہت راسخ ہو گئی ہے۔حد یہ کہ ہمارے افرادِ قوم بھی اس بات کے پوری طرح سے اب عادی ہو چکے ہیں۔ہم نے اپنے اپنے اکابر اور بڑے بزرگ بھی بانٹ رکھے ہیں۔جس کے بڑے جس رائے کو اختیار کر لیتے ہیں وہ اُسی رائے کو من جانب اللہ فرض کر لیتا ہے۔اصول فقہ کی کتب میں ہم احناف اور شوافع کے مابین لفظ’’ قُرُوْء ‘‘ کے معنی پر رونما ہونے والے اختلاف کو دیکھ چکے ہیں۔اس کے نتیجہ کے طور پر درجنوں مسائل و معاملات ایسے سامنے آئے ہیں کہ ایک فقہ میں جائز ومباح قرار دیئے گئے ہیں جب کہ بعینہٖ وہی معاملہ دوسری فقہ میں قطعی حرام وممنوع قرار پایا ہے۔اس اختلاف کو رفع کرنے کی بھی کوئی سنجیدہ کوشش سامنے نہیں آسکی ہے۔بعد میں آنے والوں نے بس اپنے خود ساختہ بڑوں سے وفاداری ہی نبھائی ہے۔اختلافِ رائے یقیناً باعثِ رحمت ہوتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ بس ایک حد تک ہی یہ اختلاف برقرار رہے اور مآلِ کار میں ایک متفقہ مؤقف سامنے آ جائے تو رحمت ہے ورنہ یہ زحمت ہی زحمت ہے۔جہاں قوم کی یکجہتی وہم آہنگی شدید طور پر متاثر ہوتی ہے وہیں افرادِ قوم کی قوتِ فیصلہ بھی سلب ہو کر رہ جاتی ہے۔ایسے ہی مختلف فیہ مقامات میں حسبِ ذیل آیتِ کریمہ بھی شامل ہے:

وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَسَآؤُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰی۔اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ اِنَّ رَبَّکَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَۃِ ھُوَ اَعْلَمُ بِکُمْ اِذْ اَنْشَاَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّۃٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ فَلَا تُزَکُّوْا اَنْفُسَکُمْ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی (النجم:۳۱۔۳۲)

بالخصوص اس آیہ کریمہ میں وارد کلمہ ’’اَللَّمَمَ‘‘ کا معنیٔ مرادی ابھی تک ایک غیر دریافت شدہ حقیقت ہے۔کم سے کم اس کی حتمی تعیین ابھی تک نہیں ہو سکی ہے۔اور ادب عربی جیسے اہم مخزن پر گہرا غور وخوض کرنے کی بجائے محض ایک سرسری نظر ڈال کر اس

کلمہ کا جو معنیٰ متعین کرنے کی کوششیں ہوئی ہیں ان کے باعث کچھ اور ہی الجھنیں پیدا ہوگئی ہیں۔اس کی کسی قدر بالتبصرہ تفصیل ''مترجمین قرآنِ حکیم کی آراء'' کے ذیل میں زیر بحث لائی جائے گی۔مختصر یہ کہ کلمہ ''اَلـلَّـمَـمَ'' کے ضمن میں بھی کئی باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔اور اکثریتی رجحان کی بھی حقائق سے کوئی بڑی اور واضح مطابقت نظر نہیں آتی۔

فی الوقت اس قضیہ کے انتخاب کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ باوجود یکہ اس کلمہ کی ترجمانی میں اختلاف واقع ہوا ہے۔مگر اس کی نوعیت ایسی ہے کہ اس اختلاف کی بنیاد پر نہ تو ملت میں کسی قسم کی تفریق پیدا ہوئی ہے اور نہ ہی مکاتب فکر وجود پذیر ہوئے ہیں۔لہٰذا اس پر گفتگو سے ملت کے کسی گروہ کی نہ تو حمایت کا کوئی پہلو نکلتا ہے اور نہ ہی کسی کی مخالفت کا تاثر قائم ہوسکتا ہے۔ بلکہ پوری طرح سے غیر جانبدار رہتے ہوئے گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔یہ احتیاط تب تک ضروری ہوگی جب تک اس اسلوب عقدہ کشائی کے ممکنہ طور پر جملہ نقائص دور نہیں ہو جاتے اور اس میں پختگی اور رسوخ پیدا نہیں ہو جاتا۔ازیں بعد جملہ مختلف فیہ معاملات زیر بحث لائے جاسکیں گے۔

بہر حال اس امر کی ناگزیریت سے کسی کے لیے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ قدیم عربی ادب سمیت دستیاب جملہ ذرائع و وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے ''اَلـلَّـمَـم'' کا ایک حتمی اور واضح معنیٰ متعین کرنے کی کوشش از سر نو کی جانی چاہیے۔سطور ذیل میں ہم اسی تعلق سے گفتگو کریں گے۔

مترجمین قرآنِ کریم کی آرا

شاہ ولی اللہ نے کلمہ ''اَللَّمَم'' کا معنی بیان کرتے ہوئے اپنے ترجمہ قرآن میں لکھا ہے:

سوائے گناہان صغیرہ (۴)

اگر اس ترجمہ پر ذرا غور کرلیا جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کا ذکر تو آچکا ہے۔صغیرہ گناہوں کے استثناء کو واضح کرنے کے لیے تو ان کا عدمِ ذکر ہی بہت تھا۔یہاں تکلف و اہتمام کے ساتھ ''اِلاَّ'' حرفِ استثناء کے تحت لا کر ہی صغائر کو حکم ماسبق سے الگ کیوں کیا گیا ہے؟ آخر اس کی ضرورت کیا تھی؟ بادیٔ النظر میں تو ''اِلاَّ'' حرفِ استثناء کے ہمراہ آیہ مبارکہ کے کلمات کی ترتیب اور ترکیب و بندش ہی ایسی ہے کہ یہ متذکرہ بالا معنی و مفہوم ان سے حاصل ہی نہیں ہوتا۔سرسری نظر میں ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کلمہ ''اَللَّمَم'' کا سے مراد یقیناً کوئی ایسی شے یا کچھ ایسے امور ہیں جو کہ کبائر و فواحش کے زمرے میں داخل و شامل ہیں۔مگر ایسے ہیں کہ کلمہ ''اَلـلَّـمَم'' کا پر غور کرنے سے ان کی جداگانہ شناخت قائم ہو جائے گی۔کیونکہ قرآنِ حکیم نے اس کلمہ کو کبائر و فواحش کی اُس نوعِ خاص کے وصف خاص کے طور پر استعمال کیا ہے۔اور اس جداگانہ و خاص شکل وصورت کے حامل ان معاصی پر گرفت و عذاب سے استثناء دے دیا گیا ہے۔اور مدعا یہ معلوم ہوتا ہے کہ رب کریم ان سے بھی صغائر ہی کی طرح درگزر کا معاملہ ہی فرمائے گا۔کیونکہ یہ بات اصولی بنیاد پر طے شدہ ہے کہ ''اِلاَّ'' حرفِ استثناء کے ذریعے ان امورِ خاص کو مذکور ماسبق کے حکم کے تحت آنے سے روکا گیا ہے۔

شائد یہی کچھ وجوہات پیش نظر تھیں کہ احمد رضا خاں قادری نے ان کلمات کے ترجمہ کو بالکل مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔

لکھتے ہیں:

''مگر اتنا کہ گناہ کے پاس گئے اور رُک گئے۔''(۵)

مگر پاس جا کر باز آجانا یا قریب پہنچ کر ارتکاب سے رک جانا تو کسی طور پر بھی قابلِ گرفت عمل نہیں ہے۔لہٰذا اس کو''اِلَّا'' حرفِ استثناء کے تحت لانے کی حاجت ہی نہیں تھی۔اس امر کی صراحتیں جا بجا ملتی ہیں کہ گرفت صرف اسی صورت میں ہو گی جب ارادی و دانستہ طور پر کسی فعل بد کا عملی ارتکاب ہو گا۔لہٰذا یہاں مزید کسی تفصیل کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

پیر کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں:

''مگر شاذ و نادر۔''(۶)

یہاں یہ بات مدنظر رکھنے کی ہے کہ انسانی زندگی میں بہت سی غلطیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو کبھی کبھار ہی رونما ہوتی ہیں۔ بالخصوص اس تصریح کی رو سے کسی بھی شخص کو پہلی بار کسی جرم کے ارتکاب کی صورت میں تو آپ نظام جزا و سزا کے تحت نہیں لا سکتے۔کیا معلوم دوبارہ کبھی وہ اس گناہ کا ارتکاب ہی نہ کرے۔زندگی بھر اگر اعادہ نہیں ہوا تو یقیناً وہ فعل شاذ و نادر کی تعریف کے تحت ہی آئے گا۔آپ جب یہ قرار دے چکے ہیں کہ شذوذ و نوادر مستثنیٰ اور نا قابلِ گرفت ہوں گے تو لازم آئے گا کہ ایسی صورت میں آپ اُس کی پکڑ کرنے کی بجائے انتظار کریں کہ بات شاذ و نادر سے آگے بڑھ جائے۔بصورتِ دیگر پہلی بار آپ اس کی گرفت کرنے کے مجاز نہیں ہوں گے۔خود آپ نے قرآن حکیم کے حکم کو جو لفظی جامہ پہنایا ہے عملی دنیا میں اس کی لاج بھی تو رکھنی پڑے گی نا؟ اور یہ بس اسی طور ممکن ہے کہ زندگی میں ایک آدھ بار کسی بھی فعل بد کے ارتکاب کی اجازتِ عام حاصل و میسر ہو جائے۔اور سب کو گرفت سے استثناء بھی حاصل ہو۔لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ نص قرآنی کا مدعا یہ نہیں کچھ اَور ہی ہے۔

ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

''الا یہ کہ کچھ قصور ان سے سرزد ہو جائے۔''(۷)

اس ترجمہ پر اگر غور کیا جائے تو بھی صغیرہ ہی ذہن میں آتے ہیں کیونکہ لفظ قصور استعمال کیا گیا ہے۔البتہ آپ نے تفسیر کرتے ہوئے متقدمین کے جو اقوال اور آراء سپردِ قلم کیے ہیں وہ بطورِ خاص لائق مطالعہ ہیں۔ان اقوال و آراء کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ''اَللَّمَم'' کا کے معاملے میں اہل علم کے اقوال و آراء میں خاصا تنوع پایا جاتا ہے۔مگر لے دے کر بات صغائر پر ہی ختم کر دی جاتی ہے۔گویا شاہ ولی اللہ ہی کی اتباع و پیروی کی گئی ہے۔اور اس تعلق سے ہم ابھی اوپر گفتگو کر آئے ہیں۔

امین احسن اصلاحی ان کلمات کا ترجمہ کرتے ہیں:

''مگر یہ کہ کبھی کسی برائی پر پاؤں پڑ گئے۔''(۸)

پھر اس کی تفسیر کرتے ہوئے آپ مزید لکھتے ہیں:

''مجاہد اور ابن عباس سے''اَللَّمَم'' کا مفہوم یہ نقل ہوا ہے کہ آدمی کسی گناہ میں آلودہ تو ہو جائے لیکن پھر اس سے کنارہ کش ہو جائے۔مطلب یہ ہوا کہ انسان سے یہ مطالبہ نہیں ہے کہ وہ معصوم بن کر زندگی

گزارے۔ جذبات اور خواہشوں سے مغلوب ہوکر گناہ کا مرتکب ہو جانا اس سے بعید نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ مطالبہ اس سے ضرور ہے کہ اس کی حسِ ایمانی اتنی بیدار رہے کہ کوئی گناہ اس کی زندگی کا اس طرح احاطہ نہ کر لے کہ اس کے لیے اس سے پیچھا چھڑانا ہی ناممکن ہو جائے۔ بلکہ جب بھی اس کا نفس اس کو ٹھوکر کھلائے وہ متنبہ ہوتے ہی توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لے۔''(۹)

جو اقوال نقل کیے گئے ہیں ان میں تو نص قرآنی کے ظاہر کے ساتھ مطابقت کے باعث کافی جان بلکہ حقیقی معنی ومفہوم کی جانب میلان کی جہت نظر آتی ہے۔ مگر آگے ان کا جو مطلب بیان ہوا ہے وہ خاص طور پر محلِ نظر ہے۔ ہماری دانست میں یہی چیز تعبیر و تشریح کہلاتی ہے اور اسی میدان میں خامیاں اور کمزوریاں عام طور سے ملتی ہیں۔ اس تعبیر کا حاصل یہ نظر آتا ہے کہ یہ اجازت تو نہیں ہے کہ کوئی کسی گناہ کو اپنی عادت ہی بنا لے۔ البتہ جب تک لاٹھی حرکت میں نہیں آجاتی یا پکڑ شروع نہیں ہو جاتی تب تک اُس فعل بد میں لگے رہنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ گویا اگر کوئی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھولے تو مضائقہ والی بات نہیں ہوگی۔ یہ غلط رجحان کو جنم دینے اور سنبھالنے سمیٹنے والی بات ہوگی۔ نیز ہر تعبیر وتشریح سے پہلے یہ بات خوب ذہن نشین کر لینے کی ہے کہ قرآن حکیم فقط شخصی ہدایت وراہبری کی خاطر نہیں اُتارا گیا ہے۔ ورنہ دین کو شخصی و ذاتی اور نجی معاملہ قرار دینے والوں کی ہم نوائی ہوگی۔ دین کو نجی اور ذاتی و شخصی معاملہ سمجھنے والے لوگ تو لفظ ''دین'' کے معنی سے بھی واقف و آگاہ نہیں ہیں۔ آپ کے اس مؤقف سے ان کو اور تائید و تقویت ملے گی۔ لہٰذا انفرادیت کو بھی ضرور ملحوظ رکھیں۔ مگر قرآنی تصریحات کو ان تک محدود کر دینے کا تاثر بھی مت پیدا کریں۔ ''دین'' کا معنی ہی: ''طرزِ حیات اجتماعی'' ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ بات ہرگز نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ نزولِ قرآنِ حکیم کی غایت عالمگیر پیمانے پر بنی نوعِ انسان کی بحیثیت مجموعی ہدایت وراہبری ہے۔ اور یہ کہ ہمیں اسی کتاب اللہ کی روشنی میں اجتماعیت و معاشرت کی تعمیر کا فرض سونپا گیا ہے۔ نیز حیات اجتماعی کی نشو وارتقاء، وحدت وسالمیّت اور بقاء وسلامتی کے لیے جملہ قوانین بھی اسی کتاب اللہ کی روشنی میں ہی ہمیں وضع کرنے ہیں۔ اقتباس مندرجہ بالا کو پڑھنے کے بعد سچی بات تو یہ ہے کہ راقم ایسے ناکس وناقص لوگوں کو حوصلہ تو بہت ملتا ہے۔ اور عین ممکن ہے کہ مدتوں اس تعبیر کو درست مان کر کوئی شخص یہ سمجھتے ہوئے اس پر عمل پیرا بھی رہا ہو کہ منشائے ایزدی یہی ہے۔ اور یہی حکم بھی ہے۔ مگر یہ اصول یاد رکھنا چاہیے کہ ''ہر قائل اپنی کہی ہوئی بات پر ہی ذمہ داری کے ساتھ پہرا دیا کرتا ہے، آپ نے اس کے قول سے اگر کچھ اور ہی سمجھ لیا ہے جو کہنے والے کی مراد نہیں تھی تو اس کی ذمہ داری قائل پر نہیں جاتی''۔ اس کے آپ خود ذمہ دار ہیں۔ اور عام انسانی کلام میں کمزوری ہو سکتی ہے مگر معاملہ قرآنِ حکیم کا ہو تو ہمارے ایمان کی بنیاد بھی یہی ہے اور فصحائے عرب کی بے بسی بطورِ واقعاتی شہادت اس پر گواہ بھی ہے کہ اس میں کسی طرح کا کوئی نقص وعیب ممکن و موجود ہی نہیں ہے۔ اگر کوئی کمی بیشی ہوتی تو یقیناً اہل زباں جن کا ناطقہ قرآنِ حکیم نے بند کیا تھا، اُس پہ خوب شور مچاتے۔ لہٰذا ماورائے حقیقت معانی مراد لے کر اُنہی پہ عمل پیرا رہنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ بلکہ مدتوں خوش فہمی میں مبتلا رہنے کے بعد حقیقت کے انکشاف سے ہوتا یہ ہے کہ پاؤں کے نیچے کی زمین سرکتی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اب اصل دقت تو یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی ترجمانی مبہم اور غیر واضح ہو تو قانون ساز ذہن ان امور کو قانون سازی کے عمل کے دوران پیش نظر رکھنے کے قابل نہیں ہو

سکے گا۔ حالانکہ قرآنِ حکیم کی یہ نص بہت صریح اور خوب واضح ہے۔ اس کو سمجھنے اور تعبیر و تشریح کے دوران البتہ ضرور ایک نمایاں فرق آ گیا ہے۔ وہ یوں کہ پورے یقین اور وثوق کے ساتھ کسی بھی ایک قول کو اختیار کر لینے کی راہ میں دقتیں و دشواریاں حائل ہیں۔

ان امور میں بہتر رہنمائی کے لیے جن عرب ادیبوں پر تکیہ کیا جا سکتا تھا ان کی اپنی حالت یہ ہے کہ عجیب و غریب طرح کی باتیں لکھتے ہوئے بھی خوفِ خدا ان کے دامن گیر نہیں ہوتا۔ یہ وہ ادیب و دانشور ہیں جنہوں نے عہدِ جاہلی کے ادبی ذخیرہ کو سمیٹ کر محفوظ بنایا ہے۔ اس ناطے ان پر اعتماد کرنے کے لیے ایک معقول بنیاد موجود تو ہے۔ مگر ان کی طرف سے مایوس کن خیالات کے اظہار کے باعث یہ اعتماد مجروح ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے آنکھیں بند رکھ کر کسی پہ بھی بھروسہ ممکن نظر نہیں آتا۔ اس کی ایک واضح مثال معروف عرب ادیب و صاحبِ جَمْهَرَة اشعار العرب، ابوزید قُرَشِیؒ کا حسبِ ذیل بیان ہے۔ آپ نے تو حد ہی کر دی ہے۔ لکھتے ہیں:

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ''(النجم:۳۲)، اِلَّا هٰهُنَا لَا اَصْلَ لَهَا۔ وَ الْمَعْنٰى:''وَ اللَّمَمَ (۱۰)

آیۂ کریمہ: ''اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ''(النجم:۳۲) کے مفردات و معانی پر گفتگو کرتے ہوئے یہ دعویٰ کر بیٹھے ہیں کہ '' اِلَّا اللَّمَمَ '' میں '' اِلَّا '' کی بنیاد ہی کھوٹی ہے، اس جگہ اس کا کوئی کردار بنتا ہی نہیں ہے۔ اور معنی ہے: ''اور فواحش اور ''لَمَم '' سے پرہیز کرتے ہیں''۔ یوں انہوں نے ''اِلَّا'' کو حرفِ استثناء کی بجائے واوِ عاطفہ کا ہم معنی قرار دے دیا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ اب تک زیرِ بحث قابلِ اجتناب اشیاء کی تعداد فقط دو تک محدود تھی۔ جبکہ ''لَمَم '' کو استثناء حاصل تھا۔ مگر اب اس فہرست میں ہی ایک اَور یعنی: ''لَمَم '' کا اضافہ ہو گیا ہے اور اب مجموعی طور پر تین اشیاء بنا دی گئی ہیں۔ یوں استثنائی امور کی بات آئی گئی ہو گئی ہے۔ یہ بات اپنی اصل اور معنی کے لحاظ سے نہایت درجہ نامعقولیت پر مبنی ہے۔ اور عین ضد ہے اس بات کی جس کا بیان قرآنِ حکیم کو مقصود ہے۔ کوئی بات اگر سمجھ میں نہ آ سکے تو خاموشی بہتر ہوتی ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے بہتر کلمات کا انتخاب و چناؤ اور استعمال جاننے والا کوئی اَور ہو ہی نہیں سکتا۔ قرآنِ حکیم کو اپنی سمجھ کے تابع کرنے کی بجائے اپنی سمجھ کو اس کے تابع کر دینے کی ضرورت ہے۔ اس لیے ابوزید کی رائے اسی لائق ہے کہ سرسری نظر میں ہی رد کر دی جائے۔

راغب اصفہانی اپنی معروف کتاب مفردات القرآن میں ''لَمَم '' کے تعلق سے گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَ اللَّمَمُ : مُقَارَبَةُ الْمَعْصِيَةِ وَ يُعَبَّرُ عَنِ الصَّغِيْرَةِ۔ وَ يُقَالُ: فُلَانٌ يَفْعَلُ كَذَا لَمًّا۔ اَىْ حِيْنًا بَعْدَ حِيْنٍ (۱۱)

''اور معصیت کے قریب تر چلے جانے کو ''لَمَمٌ '' کہتے ہیں۔ اور صغیرہ گناہ کو بھی ''لَمَمٌ '' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: ''فُلَانٌ يَفْعَلُ كَذَا لَمًّا۔ اور مراد ہوتی ہے: '' حِيْنًا بَعْدَ حِيْنٍ ''یعنی: وہ وقتاً فوقتاً ہی ایسا کرتا ہے۔''

راغب اصفہانی کی رائے اس لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی کہ آپ کی رائے میں شذوذ و نوادر سے بھی بات کو بڑھا کر پیش کیا

گیا ہے۔ گویا عادت نہیں البتہ کبھی کبھار کسی فعل بد کے ارتکاب کو استثناء حاصل ہو گیا ہے۔ معروف متکلم اور مفسر فخر الدین رازی لکھتے ہیں:

هُوَ اسْتِثْنَآءٌ مِنَ الْفِعْلِ الَّذِىْ يَدُلُّ عَلَيْهِ قَوْلُهٗ تَعَالٰى "اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ "لِاَنَّ ذٰلِكَ يَدُلُّ عَلٰى اَنَّهُمْ لَا يَقْرُبُوْنَهٗ۔ فَكَاَنَّهٗ قَالَ: لَايَقْرُبُوْنَهٗ اِلَّا مُقَارَبَةً مِنْ غَيْرِ مُوَاقَعَةٍ۔ وَ هُوَ اللَّمَمُ (۱۲)

''یہ اس فعل سے استثناء ہے جس پر ''اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ'' سے انسانی ذہن پہنچتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اس فعل کی دلالت ہی اس امر پر ہے کہ وہ لوگ اس کے قریب تک نہیں جاتے۔ تو گویا فرمانِ باری تعالیٰ: ''وہ لوگ اس گناہ کے قریب تک نہیں جاتے'' کا مدعا و مقصود یہ ہے کہ اِلّا یہ کہ ایسی قربت ہو کہ جس میں معصیت کا وقوعہ رونما نہ ہونے پائے۔ اور یہی تو ''لَمَم'' ہے۔''

بات بہت سیدھی سی ہے اور سطورِ بالا میں بھی اس تعلق سے گفتگو ہو چکی ہے کہ اگر کوئی کسی گناہ کے قریب تک تو چلا جاتا ہے مگر اس کا ارتکاب نہیں کرتا بلکہ باز آ جاتا ہے تو یہ بات تو متفق علیہ ہے کہ فقط اس عمل سے وہ گناہگار ہی شمار نہیں ہوگا۔ بلکہ ارتکاب کے اتنا قریب کہ بالکل آخری مرحلے تک رسائی کے بعد ہمت و حوصلہ کر کے واپس پلٹ آنے والے کی تو داد و تحسین ہی لازم ہوگی۔ لہٰذا اگر کوئی شخص گناہ میں پڑتا ہی نہیں ہے تو اس کے کھاتے میں فقط یہ عمل گناہ کے طور پر شمار ہی نہیں ہو سکتا۔ اور یہ عمل بطور گناہ کسی گنتی شمار میں ہی نہیں ہے تو پھر اتنے پاپڑ بیلنے اور اس کو حرفِ استثناء کے تحت لا کر مستثنیٰ کرنے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے؟ لہٰذا لازمی سی بات ہے کہ اس نصِ قرآنی کی بیان کردہ بات یہ نہیں بلکہ کچھ اور ہی ہے جس تک ہنوز ہماری رسائی نہیں ہو پا رہی ہے۔

اب ادب و بلاغت کے لحاظ سے خاص شہرت کے حامل معروف مفسر جار اللہ زمخشری کی تفسیر الکشاف سے ماخوذ رائے ملاحظہ کیجیے۔ لکھتے ہیں:

وَاللَّمَمُ: مَا قَلَّ وَ صَغُرَ۔ وَ مِنْهُ: اَللَّمَمُ: اَلْمَسُّ مِنَ الْجُنُوْنِ وَ اللَّوْثَةُ مِنْهُ۔ وَ اَلَمَّ بِالْمَكَانِ اِذَا قَلَّ فِيْهِ لَبْثَهٗ۔ وَ اَلَمّ بِالطَّعَامِ : قَلَّ مِنْهُ اَكْلُهٗ۔ وَ مِنْهُ: "لِقَآءُ اَخِلَّآءِ الصَّفَآءِ لِمَامٗ (۱۳)

''لَـمَـم'' ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو قلیل و صغیر ہو، اور اسی بنیاد پر ''لَـمَـم'' جنون طاری ہونے اور اس کے باعث صادر ہونے والی بے وقوفی کو بھی کہتے ہیں۔ ''اَلَمَّ بِالْمَكَانِ'' جب کہتے ہیں تو مراد ہوتی ہے: بہت ہی کم ٹھہرا۔ اسی طرح جب'' اَلَمَّ بِالطَّعَامِ'' کہتے ہیں تو مراد ہوتی ہے: ''بہت ہی کم کھایا۔''

اور اسی باعث کسی شاعر نے کہا ہے: "لِقَآءُ اَخِلَّآءِ الصَّفَآءِ لِمَامٗ"۔

جار اللہ زمخشری نے قلیل و صغیر کا مؤقف شائد اس لیے اختیار کیا ہے کہ قلیل و صغیر آسانی سے نظر میں نہیں آتا۔ اور پکڑ اور گرفت سے اکثر نکل ہی جایا کرتا ہے۔ کسی وقوعہ کی ایک کیفیت و حالت ایسی بھی ہے کہ کسی کی گرفت میں نہیں آتی۔ جیسے بجلی گرتی ہے۔ یا جیسے بیٹھے بیٹھے کبھی آ جانے والی نیند کی جھپکی۔ جس کی خبر ہی نہیں ہوتی کہ کہاں سے آئی اور کدھر چلی گئی۔ زمخشری نے اپنی تائید میں جو مصرعہ پیش کیا ہے اُس کے ساتھ صاحبِ مشاہد الانصاف علی شواہد الکشاف، محمد علیان المرزوقی نے دوسرا مصرعہ بھی نقل و شامل

کرتے ہوئے اس شعر کو حسبِ ذیل کلمات کے ساتھ پورا درج کر دیا ہے:

لِقَآءُ اَخِلّآءِ الصَّفَآءِ لِمَامٌ وَ کُلُّ وِصَالِ الْغَانِیَاتِ ذِمَامٌ (۱۴)

''ذاتی اغراض سے پاک، مخلص و ہمدرد دوستوں کا ملنا کبھی قسمت و نصیب سے ہی ہوتا ہے، اور بہتات کے باوجود زیورات و آرائش جمال سے مستغنی عورتوں کا کوئی بھی وصال لائق اعتناء نہیں ہوتا۔''

یعنی اچھے، مخلص اور سچے دوست تو بہت کم ہی ہوتے ہیں یا کم ہی ملتے ہیں۔ ان کا ملنا ایسے ہی غیر متوقع ہوتا ہے جیسے کوئی اَن ہونی ہو جائے۔ جبکہ دل بہلانے والے تو بہت مل جاتے ہیں۔ مگر دل کا ان کی طرف وہ میلان کبھی نہیں ہوتا جو کہ ایک خلیل کی طرف ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے۔

جاراللہ زمخشری مفردات الحدیث پر مشتمل اپنی کتاب ''الفائق فی غریب الحدیث'' میں لکھتے ہیں:

لَمَمٌ : هُوَ طَرَفٌ مِنَ الْجُنُوْنِ يَلُمُّ بِالْاِنْسَانِ (۱۵)

''لَمَمٌ'': جنون کی ایک قسم ہے جو نیند کے جھپاکے کی مانند انسان کو لاحق ہوتی ہے۔''

جھٹکے لگنے کو بھی یہ نام دیا گیا ہے۔ قرآنِ حکیم جس شے کی طرف انسانی ذہن کو متوجہ کرنا چاہتا ہے وہ معنی و مفہوم بھی یقیناً یہیں کہیں مضمر و پوشیدہ ہے۔ یہ تمامی حضرات اہلِ علم اور اصحابِ فضل و کمال ہیں۔ علم و ادب پر گہری نگاہ بھی رکھتے ہیں۔ مگر ان جملہ تصریحاتِ مندرجہ بالا پہ غور کیا جائے تو صاف عیاں ہے کہ ڈور کا وہ سرا جو قرآنِ حکیم اس کلمہ ''لَمم'' کی وساطت سے ہمارے ہاتھوں میں دینا چاہتا ہے، ہنوز ہماری ذہنی و عقلی گرفت سے باہر اور پرے ہی ہے۔

امثلہ و نظائرِ ادبِ جاہلی

معروف عرب شاعر عمرو بن قُمَیْئَہ کہتا ہے:

يَا لَهْفَ نَفْسِي عَلَى الشَّبابِ وَلَمْ أَفْقِدْ بِهِ إِذْ فَقَدْتُهُ أَمَمَا

إِذْ أَسْحَبُ الرَّيْطَ وَ الْمُرُوطَ إِلَى أَدْنَى تِجَارِي وَأَنْفُضُ اللِّمَمَا (۱۶)

''مجھے اپنی جوانی کے چلے جانے کا بہت دکھ ہے، اور بات یہ ہے کہ جب میں نے جوانی کو کھویا تو کوئی معمولی چیز نہیں کھوئی، جب میں قیمتی یمنی چادروں رَیط اور مُروط کو گھسیٹتا ہوا قریبی مئے فروش کی طرف جایا کرتا تھا اور رہ رہ کر اپنی زلفوں کو اپنے چہرے سے پرے جھٹکتا رہتا تھا۔''

''لَمَم'' کی اصل یہ ہے کہ یہ کلمہ ''لِمَّةٌ'' کی جمع ہے۔ ''لِمَّةٌ'' کہتے ہیں بالوں کی لٹ کو۔ زلف جو ہوا کے ساتھ اچانک کبھی منہ ماتھے پر آ پڑتی ہے۔ جیسے ہی پڑتی ہے فوراً ہٹا بھی دی جاتی ہے۔ اور یہ بھی طے شدہ ہے کہ منہ ماتھا اس کی جگہ اور مقام نہیں ہے۔ گویا منہ ماتھے پہ آ پڑی تو اگر فوراً پرے جھٹک دی تو ''لَمَم'' ہے۔ اس معنوی نسبت کا لحاظ کیا جائے تو ''لَمَم'' یا ''لِمَام'' ایسے افعال اور سرگرمیوں کو کہا جائے گا جو کہ اختیاری اور ارادی نہ ہوں۔ اچانک یک بیک وقوعہ ہو جائے۔ اور پتا پڑنے پر اس سے اُسی وقت چھٹکارا بھی حاصل کر لیا جائے۔ کسی منصوبہ بندی اور قصد و ارادہ کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ اور جب قصد و ارادہ طرز کی

چیزیں بیچ میں ملوث ہوں یا ان میں سے کوئی ایک بھی آموجود ہو تو وہ کارگزاری زمرہ ''لَـمَـم'' کی چیز نہیں رہ جائے گا۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہ استثنیٰ کبائر وفواحش دونوں سے یکساں ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ فواحش بجائے خود بھی کبیرہ کے زمرہ میں ہی آتے ہیں۔ سورہ نسآء کی آیت پندرہ اور دیگر متعدد مقامات پہ اس امر کی صراحتیں موجود ہیں۔ ''کبائرالاثم'' سے اس ''لَـمَـم'' یا استثنیٰ کی کوئی نسبت یا تعلق ہی نہ ہو اور صرف فواحش تک ہی اس کی عملداری محدود رہے یہ ممکن نہیں ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کبائر معطوف علیہ ہے۔ واؤ حرفِ عطف وربط ہے۔ اور فواحش معطوف ہے۔ کبائرالاثم، صورۃً مرکب ہے کیونکہ مضاف اور مضاف الیہ ہیں۔ مگر ''الاثم'' بصورتِ قید وارد ہوا ہے۔ اس کے باعث ''کبائر''، جو ''کبیرۃ'' کی جمع ہے، کا تعین اور تقید عمل میں آیا ہے۔ بایں طور ''کبائرالاثم''، صورۃً مرکب اور درحقیقت مفرد ہے۔ اس کو بتاویل مفرد معطوف علیہ بنایا جائے گا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ہمارے ہاں کچھ علوم کو ایسے نام دیئے گئے ہیں جو کہ صورۃً مرکب ہیں۔ مگر اُس علم کا ''علم اور لقب ہونے کے ناتے وہ مفرد کے درجے پر ہی سمجھے اور مانے جاتے ہیں۔ جیسے: ''اصول التفسیر''، ''اصول الحدیث'' اور ''اصول الفقہ'' وغیرہ۔ یہ تینوں اور اس طرح کی دیگر تراکیب بتاویلِ مفرد ہی ان علوم کا علم اور لقب بنتی ہیں۔ اس بنا پر ''کبائرالاثم'' مضاف ومضاف الیہ ہو کر بتاویل مفرد نام بنے گا یا لقب ہو جائے گناہوں کی اُس قسم کے لیے جو اثرات ونتائج کی سنگینی کے اعتبار سے شدید تر ہے۔ یوں یہ مفرد قرار پا کر معطوف علیہ ہوگا۔ الفواحش، اس کا معطوف ہوگا۔ معطوف علیہ اپنے معطوف سے مل کر مستثنیٰ منہ بنے اور اس سے ''لَـمَـم'' کا استثناء ہوگا۔ مستثنیٰ بھی مستثنیٰ متصل ہے۔ مستثنیٰ منقطع کا قول لغو اور باطل ہے۔ اب مستثنیٰ منہ اپنے مستثنیٰ سے مل کر مفعول بہ بنے گا ''یَـجْـتَنِبُوْنَ''، فعل معروف کا۔ اس امر پر ایک دلیل یہ بھی ہے کہ بربنائے عطف کبائر وفواحش دونوں کی نسبت ''اَلَّـذِیْـنَ یَـجْـتَـنِبُوْنَ'' کے ساتھ یکساں ہے۔ اس نسبت میں دونوں ہی یکساں ہیں تو استثناء بھی دونوں سے ہی ہوگا اور یکساں ہوگا۔

ایک اَور عرب شاعر مُنقِذ عرف جُمَیح اپنے کلام میں یہ کلمہ استعمال کرتے ہوئے کہتا ہے:

یَعْدُوْ بِهِمْ قُرْزُلٌ وَ یَسْتَمِعُ   النَّاسُ اِلَیْهِمْ وَ تَخْفُقُ اللَّمَمُ (۱۷)

''ایک بزدل وکمینہ منش شخص ان سے دشمنی کرے گا، جب لوگوں نے پوری توجہ سے ان کی طرف کان لگا رکھے ہوں گے، تب ان حالات میں ناگاہ اَن ہونی و ناگہانی آفات میں ایک اضطراب وہلچل کی سی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔''

مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو ان کا بزدل وکم عقل سردار اس راستے پر لے جائے گا کہ جہاں ان پر ناگاہ و یک بیک وہ قیامتیں اتریں گی جو ابھی ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں آئی ہیں۔ اور اس حادثے کے نتیجے میں خلقِ خدا کے سامنے یہ لوگ تماشا الگ بنیں گے اور تباہیوں کا سامنا الگ کریں گے۔

ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک عرب شاعر جعفر بن عُلبہ الحارثی کا ایک مصرعہ ''اَلَـمَّـتْ فَـحَیَّتْ ثُمَّ قامَتْ فَوَدَّعَتْ''، نقل کیا ہے اور اس کا ترجمہ یہ کیا ہے: ''وہ بس ذرا کی ذرا آئی، سلام کیا، اٹھی اور رخصت ہوگئی''۔ (۱۸) ایک مصرعہ نقل کرنے سے اختصار کا فائدہ تو حاصل ہوا ہے۔ مگر سیاق وسباق سے یہ مصرعہ جدا ہو کر اپنا حقیقی معنی دینے کے قابل بھی نہیں رہا ہے۔ اس اختصار کے باعث

اب بظاہر لگتا یہی ہے کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے آئی اور چلی گئی ہے۔ مگر فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ ایک بار پھر متذکرہ بالا ترجمہ پر غور کیجیے اور جو تصور ذہن میں آئے اس کو محفوظ کر لیجیے۔ اختصار برطرف، ذیل میں متذکرہ شاعر کے کلام سے دو اشعار پیش کیے جا رہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ یہ کلمہ فصحائے عرب کے کلام میں اپنے سیاق وسباق کے ساتھ نظر آئے گا اور توقع ہے کہ ان اشعار کی مدد سے ''لَـمَـم'' کا معنی ومفہوم خوب واضح ہو جائے گا۔ ان اشعار سے جو بھی یافت ہاتھ آتی ہے اس کا ترجمۂ بالا سے حاصل محفوظ تصور کے ساتھ موازنہ بھی بہت مفید ہوگا ایسا کرنے سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ حقائق سے ماوراء چیزیں کس طرح سے حقیقت نما ہو کر سامنے آتی ہیں اور مغالطہ میں ڈال دیتی ہیں۔ یونہی پورے نظامِ فکر وعمل کی جہتیں ہی تبدیل ہو جایا کرتی ہیں۔ شاعر کے کلام میں سے دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

عَجِبْتُ لِمَسْراها واَنّٰی تَخَلَّصَتْ — اِلَیَّ، و بابُ السِّجْنِ دُوْنِیُ مُغْلَقٗ

اَلَمَّتْ فحَیَّتْ ثُم قامَتْ فَوَدَّعَتْ — فَلَمَّا تَوَلَّتْ کادَتِ النَّفْسُ تَزْهَقٗ (۱۹)

''میں اُس کی آمد پر ششدر و حیران ہوں، اور سوال یہ ہے کہ وہ کیسے بچ بچا کر مجھ تک پہنچ گئی ہے؟ حالانکہ میں تو قید خانے کے بند دروازے کے پیچھے قید ہوں۔''

''وہ اچانک جلوہ گر ہوئی، پھر اُس نے سلام وآداب بھی بجالائے، اس کے بعد اُس نے تیاری پکڑی اور رخصت ہوگئی، تو جب وہ پیٹھ پھیر کر جانے لگی تو لگا کہ میری جان ہی نکل جائے گی۔''

شاعر کے پاس سچ مچ میں اس کی محبوبہ چل کر نہیں آ گئی تھی۔ بلکہ اچانک اُس کا محض ایک خیال آیا اور معاً اُس کی تصوراتی گرفت سے نکل بھی گیا ہے اسے یوں لگا ہے کہ اس کی محبوبہ آ گئی ہے اور پھر جیسے یہ خیال اُس کے ذہن میں آیا تھا اُسی طرح سے یہ کہیں غائب بھی ہو جاتا ہے۔ عربی ادب میں اس کلمہ کا یہ عام استعمال نظر آتا ہے۔ اہلِ زباں کے ہاں جب یہ کلمہ استعمال کیا جاتا ہے تو قائل کی مراد کچھ یوں ہوتی ہے کہ کچھ اس طور دفعۃً یا جھپاکے کے ساتھ کوئی وقوعہ رونما ہوا ہے کہ قبل اس کے کہ اُس کی سمجھ آئے، اُس کے نقوش بھی محو ومعدوم ہو چکے ہوتے ہیں۔ بنیادی طور یہی معنی دینے کے لیے قرآنِ حکیم کی اس نص میں کلمہ: ''لَـمَـم'' وارد ہوا ہے۔ بجا طور پر معتبر مانے جانے والے ادب عربی اور اس کے رجحانات کے مدّنظر ''لَمَم'' کا معنی کچھ یوں معلوم ہوتا ہے: ''اچانک ایک جھپاکے کے ساتھ کوئی وقوعہ رونما ہوتا ہے اور قبل اس کے کہ اُس کی سمجھ آئے، وہ محو ومعدوم بھی ہو چکا ہوتا ہے''۔ ادبِ عربی کی مدد سے حاصل ہونے والے اس معنی کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم قرآن حکیم کے ایک اَور مقام کا جائزہ بھی لے لیتے ہیں۔ اس کلمہ کے ایک اَور صیغہ وساخت کو قرآن حکیم نے ایک اَور مقام پر بھی استعمال کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلاً لَّمّاً (الفجر:۱۹)

''اور میراث کا مال سمیٹ کر کھا جانے میں کچھ ایسی تیزی و پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہو کہ کسی کو پتا ہی نہیں پڑنے دیتے''۔

یہ ترجمہ قدیم عربی ادب سے ماخوذ امثلہ ونظائر اور اُن کی روشنی میں بیان کردہ تصریحاتِ مندرجہ بالا کی پوری طرح سے

تائید کرتا ہوا صاف نظر آتا ہے۔ اور اس کا پیغام یہ ہے کہ میراث کا مال تم لوگ دفعتہً کچھ اس طرح سے ہڑپ کر جانے کی کرتے ہو کہ کسی کو پتا تک نہیں لگنے دیتے۔

اَلْفَوَاحِشَ کا معنی و مفہوم

دوسری اہم چیز فواحش سے پرہیز ہے۔ یہ کلمہ فاحشۃ کی جمع ہے۔ اور فاحشۃ عربی میں کہتے ہیں پول کھول دینے اور بے نقاب کر دینے والی شے۔ فحش بنیادی طور پر ایسے گناہ کو کہتے ہیں جو طے شدہ گناہ ہو۔ سب لوگ اچھی طرح سے جانتے، سمجھتے اور مانتے ہوں کہ اس عمل کا ارتکاب گناہ ہے۔ بچاؤ کا کوئی راستہ اور کسی حیل و حجت کی گنجائش ہی نہ ہو۔ اسی لیے کھلی اور واضح غلطی کو ہمارے ادب میں بھی ''فُحش غلطی'' کہا جاتا ہے۔ اس بناء پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شرم و حیاء کے معاملات سے بھی اس کلمے کا رشتہ بعد میں قائم ہوا ہے۔ مگر نزول قرآن حکیم سے پہلے کے وقتوں میں اس معنی میں بھی اس کا عام رواج ہو چلا تھا۔ وجہ اس کی یہ سمجھ آتی ہے کہ شرقاً وغرباً ہر سو شرم و حیاء کے معاملات میں ہر طرح کی بے احتیاطی و بے راہ روی ایک طے شدہ گناہ ہی سمجھی جاتی رہی ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ شرم و حیاء کے معاملات میں کسی بھی قسم کی بد پرہیزی ایک ایسی طے شدہ و مسلّمہ غلطی ہی مانی جاتی تھی جس کی کوئی تاویل ہی ممکن نہیں تھی۔ ہر دور میں ہر مہذب ملک و معاشرے نے اس کو برا ہی قرار دیا ہے۔ اور بے راہ روی کی بجائے قانونِ فطرت کے تابع بیاہ وشادی کے عمل ہی کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ اگر بہکے ہوئے لوگوں نے اس ضمن میں نئے تجربات کی راہ کہیں اختیار کی بھی ہے تو اُنہیں بس ٹھوکر ہی کھانی پڑی ہے۔ لہٰذا لفظِ فحش، فاحشہ یا اس کی جمع سب کے سب ہر اُس غلطی کے لیے استعمال ہونے والے کلمات ہیں جن کے صدور کے باعث لوگوں کے درمیان اس مرتکب شخص کا بھرم و وقار اور آبرومندانہ ساکھ جاتی رہے۔ لہٰذا قرآنِ حکیم نے اہل ایمان کو یہی تعلیم دی ہے کہ اُن فحش غلطیوں کے ارتکاب سے خود کو دور اور محفوظ رکھیں جو باعثِ شرم و عار سمجھی اور مانی جاتی ہیں۔ اسی طرح شرم و حیاء کے جملہ معاملات کے بشمول ان کھلی بداعمالیوں سے بھی گریز و پرہیز پر سختی کے ساتھ کاربند ہیں جن کے غلط ہونے میں کسی کو کوئی شک و شبہ ہی نہ ہو۔ کیونکہ یہ وہ غلطیاں ہیں جن کے باعث ایک شخص کا ذاتی وقار لوگوں کی نظروں میں مجروح ہوتا ہے۔ اُس کی ایک پُر وقار معاشرتی زندگی کی ساکھ کو شدید طور سے دھچکا پہنچتا ہے۔ اور عام لوگوں میں بھی اُس کی کوئی قدر و منزلت باقی نہیں رہ جاتی۔ ایک باوقار قوم و ملت اپنے تمامی افراد کی عزت و ناموس اور معاشرتی ساکھ کی حفاظت کو ہر دوسری شے پر فوقیت دیتی ہے۔ اسلامی تعلیمات میں بھی اس کو ترجیحات میں شامل کیا گیا ہے۔

''اِلَّا اللَّمَمَ'' کا معنی و مفہوم

'' اَللَّمَمَ '' کا ترجمہ بنتا ہے: ''اچانک ایک جھپاکے کے ساتھ کوئی وقوعہ رونما ہوتا ہے اور قبل اس کے کہ اُس کی سمجھ آئے وہ پایۂ تکمیل کو پہنچ کر محو و معدوم بھی ہو چکا ہوتا ہے''۔ اس کی مثال یہ دی جا سکتی ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی خوفناک آواز پر انسان بے اختیار اُس سمت مڑ جاتا ہے جس طرف سے وہ آواز آتی ہے۔ اس لمحے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آواز کی سمت پلٹنے کا عمل اس وقوعہ کی سمجھ آنے سے قبل ہی وقوع پذیر ہو گیا ہے۔ گویا یہ وہ بے اختیار عمل ہے جو انسانی عقل و شعور اور فہم و ادراک کی گرفت سے ماوراء ہے۔ یہ غیر شعوری حرکت ہے۔ اور دینِ فطرت سے یہ بعید ہے کہ ایسے کسی عمل پر انسان کو سزا سے دوچار کر دے جو کہ اس کی

عقل وشعور اور فہم وادراک کی گرفت سے ہی ماوراء ہو۔قرآن حکیم نے یہ استثناء دے کر فطرتِ انسانی کی اس باریکی کا بھی پورالحاظ رکھا ہے۔اس گفتگو کے پیشِ نظر زیر بحث مندرجہ بالا آیہ مبارکہ میں'' اِلَّا اللَّمَمَ '' سے مراد ومقصود کچھ یوں معلوم ہوتا ہے: ''ماسوائے پیش از عقل وشعوراَن ہونی وناگہانی غلطیوں کے''۔یہ استثنائی وضاحت درحقیقت عالمی نظامِ حیات میں پائے جانے والے اچھائی اور برائی پر مشتمل طرزِ حیات اور اس کی جزاوسزا کے معاملہ میں فطری طرزِ عمل کے تعلق سے وارد ہوئی ہے۔اچھائی پر مشتمل نظامِ حیات رکھنے والوں کے داخلی معاملات میں ایک جامع ترتیب کے ساتھ گناہوں کا تذکرہ اس انداز سے کیا گیا ہے کہ معلوم ہو کہ قدرت کو انسان سے کیا مطلوب ہے؟اس ترتیب میں سب سے پہلے بصراحت تمام کبیرہ گناہوں کا ذکر آیا ہے۔ان سے اجتناب ضروری بتایا گیا ہے۔یہ اصول یاد رہے کہ صغیرہ پر اصرار اور اس کی کثرت کبیرہ ہو جاتی ہے۔اسی طرح کبیرہ پر اصرار اور کثرتِ ارتکاب اکبرالکبائر کے زمرے میں چلا جاتا ہے۔مثلاً قتلِ عمد میں دیت نہیں ہے فقط قصاص ہے۔اگر قاتل ایک سے زائد افراد کی جان لے چکا ہو تو بدلے میں تو ایک ہی جان دے گا۔اسی طرح معاشرہ کا کوئی نہایت درجہ ناکارہ شخص کوئی انتہائی قیمتی جان بھی لے سکتا ہے۔عدل تو پھر بھی ممکن نہیں ہے۔لہٰذا انسان کو اپنی اس بے بسی کے اعتراف کے ساتھ ایک جامع اور بہتر نظامِ عدل کی تشکیل کی ضرورت ہے۔بالخصوص کبیرہ گناہوں پر گرفت کے نظام کو مؤثر بنانے کی اشد ضرورت ہے۔یہ وہ جرائم ہیں جو کسی بھی معاشرے کی کمر توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔اچھے طرزِ حیات کی خاصیت یہ ہے کہ لوگ ان جرائم کے ارتکاب سے از خود پرہیز کرتے رہیں۔ورنہ معاشرے میں موجود میکانکی عمل جس کی زمام کار ایک منظّم ومہذب معاشرے کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو حکومتِ وقت کے ہاتھوں میں ہوگی،ان کو باز رکھے گا۔اگر کسی وجہ سے ایسا بھی نہ ہوا تو افراتفری ہی پھیلے گی اور سب کا سبھی کچھ داؤ پہ لگ جائے گا۔

قرآن کی اصلاحی حکمتِ عملی

اسلام نے بھی اس ضمن میں بہت واضح اور دوٹوک احکامات صادر فرمائے ہیں۔مگر یہاں ایک چیز کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔آپ ﷺ سے پہلے کا زمانہ،زمانہ جاہلیت کہلاتا ہے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ دین وشریعت کی حقیقی قدروں کو پورے طور پر فراموش کر بیٹھے تھے۔الہامی تعلیمات کے نابود ہو جانے کے بعد اپنے عقیدہ ونظریہ اور کردار وعمل کی تشکیل کے لیے وہ عقل نارسا پر کلی انحصار کر بیٹھے تھے۔معاشرے کے اندر ان کے اپنے بنائے ہوئے نظام ہی نافذالعمل تھے۔اور ان قوانین کو بنانے کے عمل میں بھی انسان کی عقل نارسا پر ہی کلی انحصار کیا گیا تھا۔ایسے ہی جیسے آج کل مغرب میں ہو رہا ہے۔مادر پدر آزادی کی مہذب انسانی دنیا میں اصلاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔جلد یا بدیر اہلِ مغرب کو تائب ہوئے ہی بنے گی۔آپ ﷺ کی بعثت سے قبل یہی حال عالمِ عربی کا بھی تھا۔مگر دقیق نظری کے ساتھ اگر آپ ﷺ کے طریق اصلاح کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے فواحش و منکرات سے لوگوں کو محفوظ بنانے کے عمل میں بھی تدریج ہی کا راستہ اختیار کیا تھا۔کچھ لوگ تو تھے ہی ان امور کے رسیا اور کچھ ایسے بھی تھے جو کہ بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے محض شوقیہ چلے آتے تھے۔قرآن حکیم کی متعلقہ آیات کا مطالعہ یہ بھی باور کراتا ہے کہ بار بار لاٹھیاں کھٹکھٹا کر شوقیہ ادھر آ نکلنے والوں کو واپسی پر مجبور کیا گیا ہے۔سورۂ نور میں تو یہ بھی کہا گیا ہے کہ آلودہ وداغدار ماضی رکھنے والوں کو ایسے

ہی لوگ اپنا جیون ساتھی بنا سکیں گے۔ شریف و پارسا لوگ تو ان کو قبول نہیں کر سکیں گے۔ (۲۰)

سورۃ النساء میں تو ایک جگہ یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ تمہاری عورتوں میں سے اگر کوئی کسی کھلی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھے تو اس بدعملی کے ثبوت کے طور پر چار گواہ طلب کرو۔ اگر گواہی دے دیں تو پھر یہ کرو کہ تم ان عورتوں کو اپنے گھروں کے اندر ہی بند یعنی محدود کر دو اور باہر نکلنے کی ان کی آزادی سلب کر لو۔ تا آنکہ موت ان کا کام تمام کر دے یا اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے لیے کوئی اَور سبیل پیدا فرما دے۔ اور یہ بھی فرمایا بلکہ لوگوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ ایسا فعل کرنے والے دونوں عورت و مرد کو ایذا پہنچاؤ۔ اگر باز آ جاتے ہیں اور اپنی اصلاح کر لیتے ہیں تو پھر ان سے تم لوگ صرفِ نظر کرو۔ (۲۱)

قرآنِ حکیم صحیفۂ فطرت ہے۔ اسلام بھی دینِ فطرت ہے اور اس کی اساس قرآنِ حکیم پر ہی قائم ہے۔ لہٰذا کسی خرابی کے راسخ ہو چکنے کے بعد قرآنِ حکیم کی اصلاحی حکمتِ عملی ہی کارآمد ہو گی۔ یہی انسان کی فطری ضرورتوں اور ان کے تقاضوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم آہنگ بھی ہے۔

اُسوۂ عمرانی اور اصلاح معاشرہ

اسلام کے تعلق سے تمامی اُمور و معاملات بتدریج ہی پروان چڑھے اور کامیابی سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ ریاست اور ریاستی ادارے بھی دفعۃً وجود میں نہیں آ گئے تھے۔ اسی طرح اصلاح معاشرہ کا عمل بھی بتدریج ہی آگے بڑھتا ہوا صاف دکھائی پڑتا ہے۔ یہ متذکرہ بالا تمامی احکام لوگوں کو بتدریج اس برائی سے دور لانے کے لیے وارد ہوئے ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے اصلاح معاشرہ کی یہی نظیر قائم کی ہے اور یہی اُسوۂ مبارکہ آپ ﷺ نے ہمارے لیے بھی یادگار چھوڑا ہے۔ یعنی جب کبھی ایسا ہو کہ حالات اس نہج تک پہنچ جائیں جہاں تک عہدِ جاہلی میں جا پہنچے تھے تو لوگوں کو بداعمالیوں کی دلدل سے باہر نکالنے کے لیے اسوۂ رسول کریم ﷺ یہی ہے۔ قرآن حکیم بھی معاشرتی تغیرات کے پیش نظر ہی نازل ہوتا رہا ہے۔ اور آپ ﷺ قرآنی احکامات کے عملی اطلاق کے حوالے سے پوری زندگی اسی اصول پر مستقل مزاجی کے ساتھ کاربند رہے ہیں۔ لہٰذا ہم بھی اسی اُسوہ کے پوری طرح سے پابند ہیں۔ حتیٰ کہ اس اسوۂ تدریج کو نظرانداز کر کے قرآن حکیم کا حقیقی فہم بھی ناممکن ہی رہ جاتا ہے۔

نفرت وتشدد نہیں، صرف اپنائیت وشفقت

اسلام کی اصلاحی حکمتِ بالغہ کی ایک باکمال خوبی یہ بھی ہے کہ خرابیوں میں مبتلا لوگوں سے نفرت کی اجازت نہیں دیتا۔ نہ ہی ابتدائے عہد میں ہی اُن لوگوں کے ساتھ کسی سخت رویہ یا برتاؤ کی اجازت دیتا ہے۔ ہمدردی واپنائیت سے اصلاح کا عمل شروع کرتا ہے۔ اور اثنائے سفر میں عزتِ نفس بھی مجروح ہونے نہیں دیتا۔ برائیوں اور بربادیوں میں مبتلا یہ لوگ دراصل حالات کے مارے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ ہمدردی اور شفقت واپنائیت ملے تو ایک طرح سے جی اٹھتے ہیں۔ اور اسلام کا مقصودِ کل ہی انسانوں کو ایک نئی اور بہتر زندگی عطا کرنا ہے۔ جبکہ ''اِلَّا اللَّمَمَ '' سے ایسی ناگہانی ولمحاتی غلطیوں کو بھی استثناء دے دیا گیا ہے جو کسی قصد وارادہ کے تابع وقوع پذیر نہیں ہوا کرتیں۔ بلکہ ناگہانی آفت کی طرح آتی اور طوفانی ریلے کی طرح سر کے اوپر سے ہو کر گزر جاتی ہیں۔ جیسے کوئی انہونی ہو جائے۔ یہ ہو چکنے کے بعد ہی آدمی کو ہوش آتی ہے اور اس کو اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے کسی بڑی غلطی کا ارتکاب ہو گیا

ہے۔اس تصریح کی رو سے صاف نظر آتا ہے کہ انسان غیر متوقع وغیر ارادی طور پر ہی سہی مگر جرم وگناہ میں ملوث ضرور ہوا ہے۔عملاً گناہ کا ارتکاب ہوا ہے۔قریب تک جانے اور ارتکاب سے قبل باز آجانے والی تصریحات درست معلوم نہیں ہوتیں۔اسی طرح گناہِ صغیرہ کی تحدید بھی مناسب معلوم نہیں ہے۔نہ ہی اس کی نص قرآنی کے ساتھ کوئی ظاہری مناسبت موجود ہے۔اسی طرح یہ استثناء کبیرہ گناہوں اور فواحش دونوں سے ہے۔شرم وحیا کے معاملات میں بھی کچھ کبیرہ گناہ ہیں جو کہ ''فواحش'' کے ذیل میں آتے ہیں۔ لہٰذا ''فواحش'' سے ان امور کے استثنٰی کا لازمی مطلب یہ ہوگا کہ ان کیفیات واحوال پر مبنی جو بھی فواحش کے زمرے کی چیزیں ہوں گی یا جن کا اس طور پر ارتکاب ہو جائے گا اُن کو استثناء کا یہ فائدہ حاصل ہوگا۔لہٰذا وہ نا قابلِ گرفت ہی ہوں گی۔اس استثناء کی ایک عملی نظیر بھی قرآنِ حکیم سے بھی ملتی ہے۔حضرت سیدنا آدم علیہ السلام کے تعلق سے ارشادِ باری ہے:

وَلَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْماً (طٰہٰ:۱۱۵)

''ہم نے آدم کے ساتھ پہلے ہی ایک یقینی عہد طے تو کر لیا تھا لیکن پھر اُن سے بھول ہو گئی اور ہمیں اُن کے اندر عزم کا کوئی عنصر نہیں ملا۔''

حضرت سیدنا آدم علیہ السلام کی جس بھول کا قرآنِ حکیم ذکر کرتا ہے اُس کا عمیق نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ علیہ السلام کو یاددہانی جب کرادی گئی تو آپؑ نے اپنے اس عمل کا کسی طرح کا کوئی جواز پیش کرنے یا اپنے مؤقف کی صحت پر اصرار کرنے سے کاملاً گریز کرتے ہوئے بارگاہِ حق میں معافی کی التجا کی تھی۔لہٰذا عزم وارادہ کی کمی ایک واضح رعایت کا باعث بنی ہے۔

قیادت کا صوابدیدی اختیار

یہاں سے بھی اسلام کے دینِ فطرت ہونے کی رمز ہاتھ آتی ہے کہ ناگاہ اور بے سوچے سمجھے کسی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھنے والا شخص پکڑ میں نہیں آئے گا۔مگر یہ بات رہ جاتی ہے کہ اس امر کا تعین کون کرے گا کہ سزا ہی دی جائے یا عفو ودرگزر سے کام لیا جائے۔ کیونکہ نظامِ عدل تو ایک رواں دواں چکی ہے جس میں گندم کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔اور یہ کام عدالت سے ماوراء ہوسکتا ہے، حاکمِ وقت سے ماوراء نہیں ہوسکتا۔لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست میں حاکمِ وقت کے پاس صوابدیدی اختیار موجود ہوتا ہے جس کے باعث وہ اجتماعی بہتری کے تحت کسی وقت خاص حالات کے مدنظر کسی نص یا آئینی شق پر عملدرآمد کو عارضی وعبوری طور پر معطل کر سکتا ہے۔اس کی دوسری صورت یہ نظر آتی ہے کہ کسی حاکم عدالت کو کسی خاص مقدمہ کی سماعت سے روک کر مقدمہ ختم بھی کر سکتا ہے۔ریاست کو مضبوطی واستحکام عطا کرنے کے لیے ان صوابدیدی اختیارات کا حاکمِ وقت کے پاس ہونا ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ اگر حاکمِ وقت کے ہاتھ پاؤں تحریری ضابطوں سے بندھے رہیں گے تو دراصل کسی انسان کو حاکم مقرر کرنے کی حاجت ہی نہیں رہ جائے گی۔بالفاظِ دیگر حاکمِ وقت کی بابت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اپنی آنکھوں، کانوں اور احساس سے محروم ہو کر قومی معاملات کی دیکھ بھال کا فریضہ سرانجام دے۔لہٰذا اگر ہم ایسے لوگوں کو بھی مجرم بنا کر ہی پیش کریں گے جو کہ غیر ارادی طور پر کسی جرم وگناہ میں ملوث ہو گئے ہیں تو دراصل اپنے ماحول ومعاشرے کے اندر مجرموں کی تعداد اور قوت میں ہی اضافے کے مرتکب ہوں گے۔اس کی بجائے دینِ فطرت کی تعلیم یہ ہے کہ اس انداز سے اچانک اور حادثاتی طور پر لڑکھڑا جانے والے شخص کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے تو

اس کو سہارا دے کر اپنی صفوں میں ہی رکھا جائے۔اس کو تزکیہ وتطہیر میں مدد بھی فراہم کی جائے۔اس کا پلہ کسی طور نہیں چھوڑ نا چاہیے۔ گویا دینِ فطرت کی رو سے ایسے کسی عمل میں دھتکار و پھٹکار مناسب عمل نہیں ہے۔اچانک وغیر متوقع طور پر لڑ کھڑا کر کسی بے حیائی کے کام میں ملوث ہو جانے والوں کو سنبھالا دینا ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر اندیشہ ہے کہ وہ معاشرے میں اپنی عزتِ نفس گنوا بیٹھنے کے بعد ارادی طور پر ان معاملات کی طرف راغب ہو جائے گا۔جس سے ملک ومعاشرے کو اور بھی بڑے نقصانات سے دو چار ہونا پڑے گا۔لہٰذا قرآن حکیم دینِ فطرت کا پاسدار ہونے کے ناطے اپنے اس بے حد خوبصورت ضابطے میں بے سنبھال لڑ کھڑا جانے والوں کی عزتِ نفس کی حفاظت کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔اور اُن کو تماشا گاہِ عالم کی زینت بننے سے بچاتا ہے۔ان حالات میں لازم ہو جاتا ہے کہ قیادت وسیادت صوابدیدی اختیارات کی حامل ہو اور بر موقع ان کے درست استعمال پر بھی قدرت رکھتی ہو۔''اِلَّا اللَّمَمَ '' کے ذیل میں آنے والے اُمور کا حتمی تعین بھی آئینی وقانونی اعتبار سے اسی صوابدیدی اختیار کے تحت ہوگا۔

آیاتِ زیرِ بحث کا ترجمہ

اس مطالعے کے نتیجے کے طور پر سورۂ نجم کی آیات:۳۱-۳۲ کا ترجمہ اور اجمالی پیغام حسبِ ذیل معلوم ہوتا ہے:

''بس اللہ ہی کا ہے وہ سب کچھ جو آسمانوں میں ہے اور یہ جو کچھ بھی زمین میں ہے تا کہ وہ جزا دے ان لوگوں کو جنہوں نے برا کیا ان کے عملوں کے عوض اور صلہ دے ان لوگوں کو بھلائی کے عوض جنہوں نے زندگی باحسن وجوہ بسر کی ہے۔اور یہ وہ لوگ ہیں جو کبیرہ گناہوں اور کھلم کھلا بدپرہیزیوں اور بے راہ روی سے اجتناب برتتے رہے ہیں، ماسوائے اُن اعمال کے جو کہ انسانی عقل وشعور اور فہم وادراک کی گرفت سے ماوراء رہتے ہوئے ایک ناگہانی آفت کی مانند آ پڑے ہوں اور ایک پیش از عقل وشعور صدور کے بعد فی الفوران سے ہاتھ کھینچ لیا گیا ہو، یقیناً تمہارا رب اپنی مغفرت کو وسعت دینے والا ہے، وہ تم لوگوں کو خوب جانتا ہے وہیں سے جہاں اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا تھا اور وہاں بھی جب تم اپنی ماؤں کے شکموں میں ابھی پوشیدہ تھے، تو تم اپنی پاکبازی مت جتاؤ وہ خوب جانتا ہے ہر اُس شخص کو جو پرہیز گاری کے رجحان کا حامل ہے۔''

حاصلِ مطالعہ

انسیت وشناسائی کے نکتۂ نظر سے دیکھا جائے تو کلمات کا معاملہ بھی بالکل وہی ہے جو افرادِ انسانی کا ہے۔کلمات سے زبانیں وجود پذیر ہوتی ہیں تو افراد سے قومیں اور ملتیں بنتی ہیں۔افراد میں کچھ ایسے ہوتے ہیں جو اکثر ملتے ملاتے رہتے ہیں۔قدرتی طور پر ان سے واقفیت وانسیت ہو جاتی ہے۔ کچھ بہت ہی کم ملتے ہیں۔اور بے شمار ایسے بھی ہوتے ہیں جو پہلے کبھی نہیں ملے ہوتے۔قربت و بعد کے باعث اجنبیت وانسیت میں بھی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔افراد سے یہ معاملہ ہو تو اجنبیت اور غربت اور کلمات کے ساتھ ہو تو اُسے غرابت کہتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کچھ کلمات ایک جگہ پر لوگوں کا عام معمول ہیں جبکہ کسی اور جگہ پر وہ کلمات زندگی میں لوگوں نے کبھی نہیں سنے ہوتے۔لہٰذا اجنبیت وغرابت کے معاملے میں یہ امر بھی ملحوظ رہنا ضروری ہے کہ جو

حالات ہمیں درپیش ہیں، ضروری نہیں کہ سب کے ساتھ بعینہٖ وہی حالات ہوں۔ ایک ادیب کا معمول ہے کہ ادبی کتب کا مطالعہ کرتا ہے اس لیے اُس کو جو کلمات ثقیل محسوس نہیں ہوتے وہ ایک عام قاری کے لیے دردِ سر بن جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی کلمہ قبل ازیں ہماری سماعتوں سے کبھی نہ گزرا ہو اور وہی کلمہ کسی جماعت میں بہت عام طور سے استعمال ہوتا ہو۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ قرآن حکیم کے انہی مقامات پہ اختلافِ رائے پایا جاتا ہے جہاں ایسے کلمات آئے ہیں جن کا بعد کے وقتوں میں استعمال بہت حد تک کم ہو گیا تھا یا وہ مختلف طرح کی معنوی تبدیلیوں سے متاثر ہو گئے تھے۔ ان حالات میں ضروری ہو جاتا ہے کہ عہدِ جاہلی کے ادب سے اُس کلمہ کے استعمال کی نظیریں مہیا کر کے اُس کلمہ کو سماعتوں کے لیے اس قدر مانوس کر دیا جائے کہ ساری غرابت ہی جاتی رہے۔ سماعتیں مانوس ہو جائیں تو انسان میں قدرت نے یہ ملکہ ودیعت فرما رکھا ہے کہ معانی ومفاہیم کے درست تعین کے ساتھ ہر عقدۂ لاینحل کی گرہیں کھول سکتا ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن حکیم کے مختلف فیہ مقامات کی درست معنوی تعیین ہی وہ واحد راستہ ہے جو ملت کو افتراق وانتشار سے نکال کر متحد ومنظم کر سکتا ہے۔ کچھ وقت ضرور لگ سکتا ہے۔ مگر نوخیز محققین کو اگر اس تحقیقی اسلوب پہ مائل و متوجہ کیا جا سکے تو امید واثق ہے کہ ملت کی مشکلات پہ قابو پایا جا سکے گا۔ زیرِ نظر مقالہ اس ضمن میں ایک ابتدائی اور شروعاتی کوشش ہے۔ اور نقاش نقش ثانی بہتر کشد زاول کے مصداق اِس میں بہتری کی کافی گنجائش نکل سکتی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس سارے عمل کے دوران کسی خاص مذہب ومسلک کی مدد یا حمایت کی بجائے بروزِ قیامت اللہ رب ذوالجلال کی بارگاہ میں جوابدہی کا احساس غالب رہے۔ اپنے ذہنی میلانات کو قابو میں رکھتے ہوئے دلیل کو کھلے ہاتھوں کے ساتھ اپنا تصرف کرنے دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں رہ جاتی کہ خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوں۔ اس پورے معاملے میں جو چیز ایمان افروز حد تک حوصلہ دیتی اور ہمت بڑھاتی ہے وہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشادِ پاک ہے:

وَالَّذِيْنَ جٰهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (العنکبوت:۶۹)

''اور وہ لوگ جو ہماری راہ میں سعی پیہم میں لگے رہے ہم انہیں ضرور بالضرور اپنی راہیں دکھا دیں گے، اور بلاشبہ اللہ انہی لوگوں کے ساتھ ہے جو زندگی باحسن وجوہ بسر کرتے ہیں''۔

ہماری دانست میں قدرت کی مدد ونصرت اور دستگیری کے بغیر چونکہ کچھ بھی ممکن نہیں رہ جاتا اس لیے مدد ونصرت اور دستگیری کی یہ ضمانت اس راہ پہ چلنے والوں کے لیے اللہ رب ذوالجلال کا خصوصی تحفہ اور انعام ہے۔ اس کا ایک اَور فائدہ یہ بھی ہے کہ جیتے جی انسان ذہنی تشویش والجھن سے آزاد ہو کر قرآنی ہدایات پہ عمل پیرا رہنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم کے تعلق سے یہی بصیرت پرمبنی حیات ہمیں آنے والے دنوں میں سرخرو کر سکے گی۔ اب تک دیکھا یہی گیا ہے کہ یہ ملت اسلام کے دیئے ہوئے ابدی اور لازوال اصولوں سے منہ موڑ کر فقط اپنے احساسات وجذبات کی پیروی میں ہی لگی رہی ہے۔ اس روش نے ہمیں بے تحاشا نقصان بھی پہنچایا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کے ہوتے ہوئے ہماری وحدت پارہ پارہ ہوگئی۔ اگر اسلام کے زریں اصولوں کو بصیرت کی بنیاد پر ہم اپنا سکیں تو کوئی وجہ نہیں رہ جاتی کہ ہم دنیا وآخرت میں سرخرو نہ ہو سکیں۔ فی زمانہ ہر اُس جگہ سے جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں، امن وچین مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ تباہیاں و بربادیاں مسلم آبادیوں میں ڈیرے ڈالے پڑی ہیں۔ ہم اپنے رب

سے گلہ وشکوہ کرنے کے معاملے میں بھی خاصے بے باک واقع ہوئے ہیں۔ علامہ اقبال ہمارے اسی طبعی رجحان کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر　　　برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

مگر ہمیں آج تک کبھی یہ توفیق نہیں ہوسکی کہ پلٹ کر یہ جائزہ ہی لے لیں کہ آیا ہم اسلام کی حقیقی تعلیمات کے تحت ہی جی رہے ہیں یا معاملہ کچھ اور ہی ہے؟ ہم نے فرقہ وارانہ جائزے تو بہت لے لیے ہیں۔ مگر کبھی اصول عدل واحسان کے تحت انسانی دماغ کے زیر اثر ہونے والی اپنی تعبیر وتشریح کا تنقیدی جائزہ نہیں لیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی عالمی سطح پہ موجودہ حالت زار کی تمام تر ذمہ داری ہماری اسی تعبیر وتشریح کے سر ہی عائد ہوتی ہے جس کو ہم نے بعینہٖ اسلام سمجھ رکھا ہے۔ اسلام کی تعلیمات بلا شبہ ابدی ولازوال ہیں۔ کما حقہ ان پہ عمل پیرا ہوئے بغیر ہماری بستیوں میں امن وسکون کا کبھی گزر بھی نہیں ہوگا۔ یہ بات تو قرآن حکیم نے واضح الفاظ میں بیان فرما رکھی ہے۔ (۲۲) حاشا وکلا مسلمانوں کی یہ تباہی اسلام کی ناکامی ہرگز نہیں ہے۔ نہ ہی قرآن حکیم کے سر کوئی ادنیٰ سا الزام ہی رکھا جا سکتا ہے۔ یہ اس کی روشن ولازوال تعلیمات سے ہمارے اخذ کردہ معانی ومفاہیم ہی کی ناکامی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افرادی قوت کے اعتبار سے دنیا کی دوسری بڑی قوم ہوتے ہوئے بھی ہم آج ایک بند گلی میں ہی کھڑے ہیں۔ لہٰذا اب تک کی تمامی تعبیر وتشریح کا ایک بے لاگ ناقدانہ جائزہ بہر صورت ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر ملت کے شعورِ اجتماع کو بصیرت کی بنیاد کسی صورت نہیں مل سکتی۔ یہ بات تو بہت ہی واضح ہے کہ اپنے دین کے تعلق سے بصیرت نصیب ہو جائے تو پھر زندگی بھی زیادہ بوجھل ودشوار نہیں لگتی۔

مآخذ ومراجع

۱۔ فَوّاز الشّعار، مقدمۃ شرح القصائد العشر، بیروت، مؤسسۃ المعارف، ۲۰۰۶ء، ص ۵

۲۔ زیات، احمد حسن، استاذ، تاریخ الادب العربی، ترجمہ از سورتی، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، بلاسنِ طباعت، ص ۹۹۔۱۰۰ (ملخصاً)

۳۔ الرافعی، مصطفیٰ صادق، تاریخ آداب العرب، بیروت، دار الکتب العلمیہ، طبع اول: ۲۰۰۰ء، ج ۱، ص ۱۳

۴۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، قرآن مجید ترجمہ فارسی، (۳۔۳۴۳)، لاہور، پاک کمپنی، بلاسنِ طباعت، ص ۶۳۳

۵۔ فاضل بریلوی، احمد رضا خاں قادری، کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن، (۳۶۲)، لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، بلاسنِ طباعت، ص ۶۳۳

۶۔ الازہری، کرم شاہ، پیر، ضیاء القرآن، لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ربیع الثانی: ۱۴۰۰ھ، ج ۵، ص ۳۳

۷۔ ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، جنوری ۲۰۰۸ء، ج ۵، ص ۲۱۱

۸۔ اصلاحی، امین احسن، تدبرِ قرآن، لاہور، فاران فاؤنڈیشن، فروری: ۲۰۰۵ء، ج ۸، ص ۶۹

۹۔ ایضاً ص ۱۷

۱۰۔ ابوزید، محمد بن ابی الخطاب، القُرَشِی، جمھرۃ اشعار العرب، بیروت، دار ارقم، بلاسنِ طباعت، ص ۱۳

۱۱۔ راغب اصفہانی، حسین بن محمد بن مفضل، ابوالقاسم، مفردات الفاظ القرآن، کراچی، میر محمد کتب خانہ، بلاسنِ طباعت، مادّہ: ل م م، ص ۴۷۴

۱۲۔رازی،محمد بن ضیاءالدین عمر،التفسیر الکبیر،مصر،مکتبہ البہیہ ،بلا سن طباعت،ج ۱۵،ص ۸،ح:۲۹،النجم:۳۲

۱۳۔جاراللہ زمخشری،محمود بن عمر،الکشاف،بیروت،دارالکتاب العربی،بلا سن طباعت،ج ۴،ص ۴۲۵

۱۴۔المرزوقی،محمد علیان،مشاہد الانصاف علی شواہد الکشاف (فی ذیل الکشاف)،بیروت،دارالکتاب العربی،بلا سن طباعت،ج ۴،ص ۴۲۵

۱۵۔جاراللہ زمخشری،محمود بن عمر،الفائق فی غریب الحدیث،بیروت،دارالفکر،طبع ثالث:۱۹۷۹ء،ج ۳،ص ۳۳۰

۱۶۔ابوتمام،حبیب بن اوس الطائی،دیوان الحماسہ،کراچی،میر محمد کتب خانہ،بلا سن طباعت،۱۹۶

۱۷۔اَلضَّبِیّ،مفضل بن محمد،ابوالعباس،اَلمُفَضَّلِیَّات،بیروت،دارارقم،۱۹۹۸ء،ص ۳۰

۱۸۔ابوالاعلیٰ مودودی،تفہیم القرآن،محولہ بالا،ج ۵،ص ۲۱۲

۱۹۔البصری،علی بن ابی الفرَج،الحماسۃ البصریہ،قصیدہ:۹۳۲،تحقیق وشرح:عادل سلیمان جمال،ڈاکٹر،قاہرہ،مکتبۃ الخانجی،۱۹۹۹ء،ص ۱۰۶۲

۲۰۔النور:۲۶

۲۱۔مفہوم آیات،النساء:۱۵۔۱۶

۲۲۔آل عمران:۱۰۳